’قبضِ زماں‘ میں ’راوی‘ کی تبدیلی اور تصورِ زماں

ڈاکٹر ظفر حسین ہرل *
Dr. Zafar Hussain Haral
ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی **
Dr.Tariq Mahmood Hashmi

Abstract:

"In this global era, A literary piece of art propagates around the globe immediately after its publishing in any corner of the world. This is due to speedy translation and quick publishing with the use of modern gadgets. So the techniques used in the famous literary work anywhere in the world recognized and replicated elsewhere. This phenomenon shoes its influences on modern Urdu literature. Particularly Urdu fiction writers of twenty first century made use of the universal style's techniques in their writings. The best example of this phenomenon in modern Urdu novel is Qabz-e zaman(2014) by Shamsurrahman Faruqi(1935-). In this research article I infer that he used modern narrative techniques in his novel Qabz-e zaman from which magic realism is more prominent and exclusive. Shamsurrahman Faruqi is found of great lost GANAGA JAMNI civilization of Mughal sultanate of Dehli(1526-1857). Technically it is very necessary that to depict the language and cultural development the narrator must be changed to show the long span of history of sub continent. So he looks to a Sufism's term 'Qabz-e zaman', which can be used as a tool in magic realism technique. His narrator Gul Muhammad travels in different era of sub continent history, due to Sufism term 'Qabz-e zaman'. He also used the old folk lore, oral literature and old text in this novel as well. These elements are very essential for the magic realistic technique in the fiction.

KEY WORDS: Urdu Novel, Shamsurrahman Faruqi, Qabz-e zaman , narratology , magic realism, narrator."

انسانی سماجی ارتقا کی تاریخ میں طاقت ور ترین ایجاد ’لفظ‘ ہے جو خیال کا جامہ ہے۔ جدید لسانیات الفاظ کے اجزا کو نشان [1] کہتی ہے جس کو ابجد کے علاوہ کسی اور شکل یا آواز میں بھی معروض

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد
☆☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ نشان مختلف آوازوں کو متشکل کرتے ہیں۔ آوازوں کے منفرد مجموعے خیالات کی ترسیل کرتے ہیں۔ خیالات کی ترسیل کی کو روکنا دنیا کا مشکل ترین عمل ہے لیکن آج مقتدر برقی علمی مخزونوں اور چھاپہ خانوں پر اختیار کے ذریعے من چاہے خیالات کی ترسیل اور غیر پسندیدہ نظریات کی روک میں کوشاں ضرور ہیں۔[۲] گویا خیال سے مفید ترین اور خطرناک ترین شے اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔[۳] خیال کی لامحدود قوت کا اظہار دنیا میں مختلف سائنسی، مذہبی، سماجی ،سیاسی اور معاشی نظریات کی شکل میں بھی موجود ہے۔ معاصر فلسفیانہ نظریات کا زبان اور اس کے نظام پر مرکوز ہو جانا اس بات کا بین ثبوت ہے۔[۴] یورپ میں جدید فلسفہ کے بانی رینے ڈیکارٹ (۱۵۹۶ء۔ ۱۶۵۰ء) کے بعد فلاسفہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ خیالات کی ترسیل کے بنیادی صفت صرف اور صرف زبان کے اندر موجود ہے لہٰذا تمام علوم کی بنیاد اسی پر ہے۔ زبان علم اور انسان کے درمیان پردہ کا کام کرتی ہے۔ الفاظ جن سے زبان ترتیب پاتی ہے اپنے معنی کس طرح دیتے ہیں۔ اس سوال نے جدید تنقیدی تھیوریز کو شدید متاثر کیا ہے۔ اب تمام ادبی تخلیقات کو سماجی مظاہر کی شکل میں دیکھتے ہوئے زبان کے ذریعے انسان، اس کے اردگرد کی کائنات اور فطرت یا تخلیق کار یعنی خدا سے اس کے تعلق کو سمجھنے کی کوششیں جاری ہیں۔

خیال، نظریہ یا مفہوم یا موضوع جو کچھ بھی کہا جائے وہ لفظ کے بغیر ناممکن ہے۔ خیال مجرد (Abstract) ہیں لیکن مجسم (Concrete) شکل صرف 'لفظ' کی ذریعے ہی اختیار کر سکتے ہیں۔ 'لفظ' زبان کی تعمیر کرتے ہیں اور زبان معاشرے کی بنیادی اور اہم ترین شناخت ،علوم کی ترسیل و ترویج کی ذمہ دار اور تہذیب کے پھلنے پھولنے کی ضامن ہے۔ زبان کی کئی جہات ہیں مگر سب سے اہم جہت معاصر سماجی صورت حال ہے۔ یہ ذخیرہ الفاظ ، جملے کی ساخت ،روزمرہ اور محاورات کے لیے اپنے سماج کی مرہون منت ہے۔ یہی زبان ہی ہے جو ادبی تخلیق کا واسطہ (Medium) ہے۔ زبان اگر معانی کی تشکیل کے لیے سماج کی مرہون منت ہے[۵] تو یقیناً کسی مخصوص علاقہ یا مخصوص زمانے کی زبان اس علاقے اور زمانے کی معاشرتی صورت حال کی عکاسی بھی ہے۔ اس لیے کوئی بھی ادبی فن پارہ ادبی اقدار کے ساتھ ساتھ اس معاشرے کی صورت حال کا عکاس بھی ہے جس معاشرہ سے زبان کو بطور وسیلے کے لیا گیا ہے۔

دوسری طرف دیکھیں تو تخلیق کار اپنی پوری زندگی کسی مخصوص نظریہ زندگی کی ترویج کرتا رہتا ہے۔ یہ نظریہ اس کے تمام فن پاروں کا بنیادی تھیم ہوتا ہے۔ گو وہ کئی ایک ضمنی

موضوعات میں اس کا اظہار کرتا ہے۔ یہ بات ' قبضِ زماں (۲۰۱۴ء)' کے خالق شمس الرحمن فاروقی پر بھی صادق آتی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی قدیم ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا شیدائی ہے۔ اس کی تمام تخلیقات مثلاً 'کئی چاند تھے سرِ آسماں (۲۰۰۶ء)'، ' اردو کا ابتدائی زمانہ (۲۰۰۱ء)'، 'شعرِ شور انگیز' تین جلدیں (۱۹۹۱ء۔۱۹۹۳ء)، اور 'سوار اور دوسرے افسانے' وغیرہ اس بات کا ثبوت ہیں، جن میں بنیادی تھیم اردو زبان کی قدامت اور اس کی تہذیبی قوت کا ابلاغ ہے یا یوں زیادہ مناسب ہے کہ زبان کی وکالت ہے۔ نوآبادیاتی دور میں فاروقی کی پیدائش اور تعلیم اور آزاد ہندوستان میں سول سروس میں شمولیت اور زندگی کرنا اس کو مغل گنگا جمنی تہذیب کا گرویدہ بنا گیا۔ ہندوستان پر مغلیہ حکومت (۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک)، اردو کی ترویج و ترقی اور اقداری وقعت اس کے لیے پسندیدہ ہے ساتھ ہی نوآبادیاتی دور میں اس کی دلچسپی بڑی اہم ہے۔ ان کے ہاں آزادی سے قبل نوآبادیاتی دور کی پسندیدگی کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں ایسے مظاہر، ادارے اور اشخاص ابھی موجود تھے جو قبل ازیں ثقافتی اظہار کے اعلیٰ نمونے تھے۔

ہمارے ہاں ماضی کو دیکھنے کے جو معروف ذرائع ہیں ان میں تخلیق کاروں کے لیے دو سب سے زیادہ اہم اور سہل حصول ہیں یعنی تاریخ اور زبان، تاریخ میں ہمہ جہت علمی تاریخ بھی شامل ہے۔ اس کا ایک حصہ تصوف کی تاریخ بھی ہے۔ تاریخ کی کہانی کو کسی حد تک سیاسی یا مذہبی نظریات کے زیرِ اثر تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے لیکن زبان ماضی کی جو کہانی ہمیں سناتی ہے اس پر شک کی گنجائش نہیں ہے وہ سوفی صد سچ ہوتی ہے۔ 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' کے برعکس اس دفعہ شمس الرحمن فاروقی نے سیاسی تاریخ کی بجائے برصغیر کی صوفیانہ روایت سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ قدیم و جدید زبان کے ذریعے ہندوستان کی اس گنگا جمنی تہذیب کو پیش کیا ہے جو اس کے لیے محبوب کا درجہ رکھتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اقوام کو عالم سے روشناس کرانے کا بنیادی عنصر ان کی تہذیب ہی ہے وہی تہذیب جو استعماریت سے قبل ہندوستان میں مسلم رواداری اور وسیع المشربیت کی علامت تھی۔ فاروقی نے اس تہذیب کو دکھانے کے لیے ' قبضِ زماں' میں جو تکنیک استعمال کی ہے وہ کتنی انوکھی ہے۔ روسی ہیئت پسندی کے زیرِ اثر اجنبیانے کے عمل کو ذہن میں رکھیں تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ آج بھی تخلیق کار ناول کے پلاٹ اور بیانیہ کی ہیئت کے ایسے تجربات کر رہا ہے جو اس کے اسلوب کو اجنبی بنانے میں معاون ثابت ہوں۔

ناول میں یہ اسلوب گنجلک یا زیادہ مناسب لفظ پیچیدہ پلاٹ کے ساتھ مل کر، جیسا کہ جادوئی حقیقت نگاری کی تکنیک میں ہوتا ہے، زیادہ پر لطف اور حظ بخش ہو جاتا ہے۔ 'قبض زماں' میں شمس الرحمن فاروقی نے تصوف کی اصطلاح اور تکنیک کو استعمال کیا ہے، انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> "قبض زماں" میں ایسا کچھ نہیں، صرف قدرت الٰہی کا کرشمہ ہے۔ میں نے اس واقعے کو اپنی افسانہ گوئی کے لیے استعمال کر لیا ہے۔ اس میں کوئی مذہبی نکتہ نہ فرض کیا جائے۔ جب میں نے مولانا حامد حسن قادری مرحوم کے رسالے میں یہ قصہ پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ میرے طرز افسانہ گوئی کے نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔ یہ قصہ گوئی کے مسائل تھے جنھیں میں نے اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کی ہے۔"(۶)

ادب زندگی کو اس کائنات کے تناظر میں کلی حیثیت سے دیکھنے کا عادی ہے۔ انسانوں کو زندگی کے مسائل سے نپٹنے کی راہ سجھاتا ہے۔ مکمل موضوعی انداز میں ایسے لطیف پیرائے استعمال کرتا ہے جو کہ اس کے حظ بخش پہلو سے ماوراز ندگی کی ایسی سچائیاں بیان ہوں جو انسان کو زیادہ بہتر اور کامل انسان بننے میں راہنمائی کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔ بعینہ تصوف کا بنیادی مقصد انسان کے روحانی ارتقا کی تکمیل ہے اور اس روحانی ارتقا کا راستہ مادی دنیا سے گزر کر جاتا ہے۔ یوں تصوف ہمیں بہترین زندگی گزارنے کی سفارش کرتا ہے تاکہ انسانی روح کو بالیدگی حاصل ہو سکے۔ ان دو پہلوؤں میں جو کہ ادب اور تصوف کے مشترک عناصر ہیں، دونوں ایک ہیں۔ اس کا ثبوت اردو اور مقامی زبانوں کی ادبی تاریخ اور برصغیر میں صوفیاء کی روایت سے باآسانی مل سکتا ہے(۷) جہاں یہ نظر آتا ہے کہ برصغیر کے صوفیا نے اپنے دور اور علاقے کی مروجہ زبان اور اصناف ادب میں نام پیدا کیا اور ادب کے بنیادی وصف یعنی مسرت کو پھیلاتے ہوئے اپنے پیغام کو عام کیا۔ جیسا کہ نجیب محفوظ نے کہا ہے کہ ادب کا بنیادی مقصد مسرت و دانش کا ابلاغ ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> " میری قوم کے ادبی مصنف یہ لطف و انبساط حاصل کریں گے کہ آپ کے برابر، پوری اہلیت اور اعزاز کے ساتھ بین الاقوامی ادیبوں کے ہمراہ بیٹھیں گے جنہوں نے ہماری اس دکھوں کی ماری دنیا میں مسرت و دانش کی خوشبو پھیلائی ہے۔"(۸)

اس سلسلے میں قدیم اردو، پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور کشمیری زبان کے صوفی شعرا میں حضرت داتا گنج بخش، فرید الدین گنج شکر، امیر خسرو، خواجہ میر درد، بلھے شاہ، شاہ حسین، وارث شاہ، میاں محمد بخش، ' عارفہ للہ ' ، خوشحال خان خٹک، رحمان بابا، مست توکلی، شاہ عبد الطیف بھٹائی، خواجہ غلام فرید، سلطان باہو کی شاعری اس روایت کی پائندہ مثالیں ہیں۔ جدید اردو دب کی تاریخ میں اس کی سب سے معروف اور اہم مثال علامہ اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) کے مرشد اور دنیائے اسلام کے معروف صوفی مولانا جلال الدین رومی (۱۲۰۷ء۔۱۲۷۳ء) کی ہے جن کو ان کی مثنوی نے لافانی کر دیا ہے اور جس کے ذریعے انہوں نے اس لافانی پیغام کو عام کیا جو ایک ہزار یا کم و بیش کا عرصہ ہوا لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کر رہا ہے۔ یہ مثنوی کوئی ایسی کتاب نہیں جو صرف خانقاہ اور صوفیانہ دائرں کے لوگ ہی پڑھتے ہیں اور یہ خشک صوفیانہ مضامین پر مشتمل ہے۔ بلکہ ایسی ادبی تصنیف ہے جو اپنے اندر مسرت کے تمام منابع کو سمیٹے ہوئے ہے اور ہر باذوق قاری کے لیے دلچسپی کا سامان رکھتی ہے۔[9] یہ روایت بہت طویل ہے اور برصغیر میں ایسے اہل صفاء کی فہرست بھی بڑی طویل ہے جنہوں نے اپنا پیغام ادبی تصنیفات کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا۔

کیا صوفیاء نے صرف شاعری کے ذریعے اپنی بات لوگوں تک پہنچائی۔ دراصل بات یوں نہیں ہے ہر زمانہ اپنے عصری مزاج کے مطابق اصناف ادب کی پرورش کرتا ہے۔ یہ اصناف اس دور کے فکری، تہذیبی اور ادبی تناظر کے مطابق ہوتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب پوری دنیا میں شاعری کا بول بالا تھا کیونکہ وہ زبانی روایت (Oral Traditon) کی ضروریات کے عین مطابق تھی۔ لہٰذا مروجہ اصناف شاعری کو ہی ذریعہ سخن بنایا گیا۔ معاصر صورت حال قدیم کے بالکل برعکس تحریری روایت کا دور ہے لہٰذا نظم لازمی ضرورت نہیں رہی بلکہ نثر دقیق اور وسیع مضامین کو با آسانی بیان کرنے کی صلاحت کی بنا پر زیادہ مروج ہو گئی ہے۔ اس وقت ادبی نثر کی سب سے اعلیٰ شکل فکشن کی صورت میں جدید دور کے تقاضوں کو پورا کر رہی ہے۔ فکشن میں شامل اصناف میں سے ناول سب سے معروف صنف ادب ہے جو بیانیہ انداز[10] کی حامل ہے۔ اردو ادب میں متصوفانہ مضامین پر مشتمل ناولوں کی مضبوط روایت موجود ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے اسلامی تاریخ کی متنازع اور معروف ہستی حسین بن منصور حلاج کی زندگی پر ' دشت سوس ' جیسا ضخیم ناول لکھا۔ یہی نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کی ایک اور متنازع اور معروف شخصیت قرۃ العین طاہرہ کی زندگی پر 'چہرہ بہ چہرہ روبرو ' کے نام سے ناول لکھا ۔ اس روایت کو قائم رکھتے ہوئے آج کے معروف ناول نگار شمس الرحمن

فاروقی(۱۹۳۵ء۔) نے اپنے پہلے ناول 'کئی چاند تھے سر آسمان(۲۰۰۶ء)' میں مرحوم دہلی کے آخری مغلیہ دور کی متوازی تاریخ کے ساتھ ساتھ دربار کی صوفی روایت کا ذکر بھی کیا ہے۔فاروقی کا دوسرا ناول ' قبض زماں' (۲۰۱۴ء) بظاہر صوفیانہ اصطلاحات کا حامل ہے مگر کمال فن کاری سے بیانیہ کی اب تک کی جدید ترین تکنیک 'طلسماتی حقیقت نگاری' یا' جادوئی حقیقت نگاری' استعمال کرتے ہوئے اٹھارویں صدی کی دہلی کی وسیع المشرب تہذیب کو بیان کیا ہے۔

'طلسماتی حقیقت نگاری' جیسا کہ آصف فرخی[11] نےMagic Realism کا ترجمہ کیا ہے یا عبدالعزیز ملک[12] نے جس کو 'جادوئی حقیقت نگاری' کہا ہے بیانیہ کی جدید اور معروف تکنیک ہے جس نے ناول نگاروں کو قدیم متون کے وسیع تر ذخائر کو برتنے کے اختیار عطاء کر دیئے ہیں۔ جے۔اے۔کڈن(J.A.Cuddon) کی ڈکشنری میں جادوئی حقیقت نگاری کے جو بنیادی عناصر گنوائے ہیں وہ اس تکنیک کو زیادہ واضح انداز میں سمجھنے میں مددگار ہیں۔انہوں نے جادوئی حقیقت نگاری کی درج ذیل نمایاں خصوصیات کو بیان کیا ہے:

۱۔بیانیہ میں تخیلاتی اور حقیقی دنیا کا امتزاج

۲۔ حقیقی واقعات کا ایک ہی لمحے میں مختلف جگہوں پر واقع ہونا

۳۔روایتی ترتیب سے انحراف کرتا پلاٹ

۴۔خوابوں اور لوک داستانوں کا بیانیہ میں استعمال

۵۔بظاہر ماورائے حقیقت بیانات اور پر اسرار علوم کا ذکر

۶۔ تحیر آمیز، عجیب و غریب اور غیر واضح عناصر کی موجودگی[13]

' قبض زماں' میں کس طرح ان چھ بنیادی تصورات میں سے چند کو ضرورت کے مطابق کو اپنے منفرد انداز میں برتتے ہوئے بیانیہ ترتیب دیا ہے۔اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔شمس الرحمن فاروقی نے ' قبض زماں' کا پیش لفظ بھی لکھا ہے، روایتی طور پر ناول میں پیش لفظ کہاں ہوتے ہیں۔لیکن اس نے لکھا ہے اور ایسی روایات کے بارے میں بتایا ہے جہاں انسان پہ مختلف اوقات میں وقت کی الگ الگ جہات بیت گئیں گویا قبض زماں یا بسط زماں وقوع پذیر ہوا یوں پلاٹ کی پیچیدگی کو حق بجانب ثابت کرنے کی اپنی سی کوشش ہے جہاں ارسطو کی وحدتوں کی روایت کو توڑتے ہوئے کہانی کا زمانہ مسلسل نہیں بلکہ کم و بیش تین صدیوں کی فصل کے بعد ہیرو کو زندہ کیا جاتا ہے جو بظاہر ناممکن ہے۔یقیناً اسکے پاس کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ وہ تین چار سو سال پرانی زبان اور

اس تہذیب کو کس طرح ناول کے بیانیے میں برتتے۔ اردو ناول کی تاریخ میں 'آگ کا دریا' (۱۹۵۹ء) ایسی مثال ہے جس میں پرانے دور کی زبان کو استعمال کیا گیا ہے لیکن اس تکنیک کو برتنا اب فاروقی کے لیے مشکل تھا۔ اور یہ تصور کہ ایک پرانے زمانے کا شخص آج کس طرح چلتا پھرتا دکھایا جا سکتا ہے ناولائی[۱۴] تصور بھی ہے۔ پلاٹ کی گھڑت کا قرۃ العین حیدر (۱۹۲۷ء۔۲۰۰۷ء) کا طریقہ یہاں استعمال کرنا مناسب نہ تھا۔ فاروقی نے ایسا کردار تخلیق کیا جو خاص واقعہ کی بنا پر تین سو سال کا سفر ایک گھڑی میں طے کر کے بعد کی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ بیانیہ میں پہلے پر اسرار فضا کے ترتیب دینے کے بعد روای کی 'گل محمد' سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس وقت راوی سمجھ نہیں پا رہا کہ وہ کس کیفیت میں ہے جہاں نہ نیند ہے نہ خواب ہے اور نہ بیداری ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> "میں نے دوبارہ اٹھنا چاہا، لیکن فضول۔ آواز بھی اسی طرح بند تھی، گلا اسی طرح خشک تھا۔
>
> "بندگی عرض کرتا ہوں حضور خان دوراں، عالی جاہ۔ مزاج سرکار کا کیسا ہے۔؟ "
>
> عجیب سی آواز تھی۔ کچھ کھوکھلی سی۔ لہجہ بھی ہماری طرف کا نہ تھا۔ لیکن مغربی اضلاع والوں جیسا بھی نہ تھا۔ لگتا تھا یہ شخص مدتوں فارسی بولنے والوں کے ساتھ یا آس پاس رہا ہو۔ بچھم والے ذرا ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہیں۔ ایرانی یعنی آج کے ایرانی، الفاظ کو تیزی سے ادا کرتے ہیں۔ اس شخص کی بھی ادائیگی ذرا تیز تھی۔ حرکات و سکنات بدن میں فدویانہ پن کے باوجود لہجے میں کچھ قوت اور سختی تھی۔
>
> نیند کا ایک جھونکا آیا۔ میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں، ہوا بھی ٹھنڈی اور شیریں ہو گئی تھی۔" (۱۵)

پلاٹ کی ترتیب کی یہ شکل یعنی یہ کہانی ہمیں تذکرہ غوثیہ[۱۶] کے ایک واقعہ میں نظر آتی ہے۔ جس میں مؤلف مولوی گل حسن نے شاہ عبدالعزیز دہلوی کا بیان غوث علی شاہ کے حوالے سے نقل کیا ہے جس میں روزگار پیشہ جوان کا ایک طوائف سے ادھار لینے اور طوائف کے مرنے کے بعد نوجوان کا اس کی قبر میں داخل ہونے کے واقعہ کی تفصیل ہے۔ پیش لفظ میں فاروقی نے شاہ عبدالعزیز دہلوی کے بیان کا حوالہ دیا ہے لیکن ' تذکرہ غوثیہ ' کی بجائے مولانا حامد حسن قادری کا حوالہ دیا ہے اور شاید 'تذکرہ غوثیہ ' ان کی نظر سے نہیں گزرا یا انھوں نے اس کے بارے میں کچھ سنا نہیں۔

شمس الرحمن فاروقی کا 'تذکرہ غوثیہ' کا حوالہ دینے سے پہلو تہی کرنا اپنی جگہ پر لیکن کہانی کے سارے واقعات اور کردار اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ اسی واقعہ کو بنیاد بنا کر افسانوی آمیزش سے ناول کا پلاٹ مرتب کیا گیا ہے۔ قبض زماں کا پلاٹ اس بیس سطری کہانی پر کھڑا نظر آتا ہے اور فاروقی کا زرخیز تخیل سوا سو صفحے کے ناول کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہاں سے ایک نیا سوال ذہن میں آتا ہے کہ ایک واقعہ بنیاد ناول کا پلاٹ ترتیب دیتے ہوئے یقیناً کردار کا نام بھی فاروقی کے ذہن میں آیا ہوگا۔ کیا عجیب ہے 'تذکرہ غوثیہ' کے مؤلف مولوی گل حسن کے نام سے متاثر ہو کر ناول میں ہیرو کا نام 'گل محمد' رکھا گیا ہو۔ لیکن اس کی دوسری اور اہم ترین معنویت فارسی کی کہاوت، 'زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد'(۱۷) ہے۔ ناول نگار تو اپنی مرضی کی دنیا تخلیق کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے وہ کیوں 'گل محمد' (ناول کا ہیرو) کو ناول میں ساکن رکھے گا۔ وہ زمان و مکان کے روایتی تصورات کو توڑ کر گل محمد کو ایسا متحرک کرتا ہے کہ وہ صدیوں کا فاصلہ 'گھڑیوں' طے کرتا ہے۔ گل محمد سلطان ابرہیم لودھی (دور حکومت ۱۵۱۷ء۔ ۱۵۲۶ء) کے دور میں زندگی بسر کر رہا ہے اور ایک امیر کے ہاں احدی (سپاہی) کے بطور ملازم ہے۔ 'قبض زماں' میں مرقوم ہے:

> "خداوند عالم سکندر سلطان لودی ابن سکندر سلطان لودی فرمانرواعرصہ بیس سال سے ملک ہندوستان، پنجاب، دوآبہ ہندوشرق، اور بنگالے سے بندیل کھنڈ تک کے علاقے پر نہایت شان اور دلجمعی اور انصاف و عظم وشان کے ساتھ تھے۔ یہ آخری برس (۹۲۳ھ) ان کی حکومت بابرکت کا تھا۔ لیکن خبر کسی کو کیا تھی اقبال سکندری کا یہ آفتاب اب لب بام ہے۔ بلاد روم کے آگے مشرق میں دارالخلافہ اسلام، شہر فرحت و قوت التیام، یعنی حضرت دہلی کو چھوڑ کر خداوند عالم نے ایک نیا شہر گوالیار سے کچھ اوپر دہلی کے جنوب میں آگرہ نام کا سنہ ۹۱۰ تعمیر کر کے اپنا دارالسلطنت ٹھہرایا تھا۔" (۱۸)

احدی گل محمد ناول کے پلاٹ کے مطابق چند گھڑیاں قبر میں گزارنے کے بعد ابراہیم لودھی کے دور سے نکل کر شہزادہ روشن اختر محمد شاہ (دور حکومت ۱۷۱۹ء۔ ۱۷۴۸ء) کے دور میں پہنچ جاتا ہے۔ ناول میں اس کا حوالہ یوں آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اس وقت کے بادشاہ کا نام واقعی احمد شاہ تھا۔ یہ اس کے سنہ جلوس کا دوسرا سال تھا۔ یہ لوگ سنہ ہجری اور سنہ ہندی کے ساتھ سنہ جلوس بھی گنتے تھے، یعنی بادشاہ حال کو فرمانروائی کرتے کتنے برس گزرے۔ شاہی کواغذ اور فرامین میں اور رسمی

مواقع پر سنہ جلوس مندرج کرنے یا اس کا اعلان کرنے کا التزام تھا۔ یہ بادشاہ خاندان مغلیہ کے تھے اور ان کا سلف ظہیر الدین محمد بابر ہے جو کابل میں مدفون ہے اور جس نے میرے سلطان ابراہیم لودی سے سلطنت چھینی تھی۔ سنہ ہجری کے حساب سے یہ سال ۱۱۶۴ء ہے اس طرح میں امیر جان کے مزار کے اندر ڈھائی گھنٹے نہیں، کوئی ڈھائی سو برس گزارے تھے۔" (۱۹)

ناول کا پلاٹ اور پیچیدہ ہوتا چلا جاتا ہے لیکن فاروقی اس ساری فنکاری کے دوران اپنے موضوع سے متعلق ہی رہتا ہے۔ وہ گنگا جمنی تہذیب کا شیدائی ہے۔ اس دفعہ زبان کی وساطت سے قدیم تہذیب کے اہم مظاہر کو ہمارے سامنے لانے کی جستجو میں ہے۔ زبان تہذیب کو اور تہذیب زبان کو بناتی ہے۔ لیکن قدین تہذیب کا اہم ترین دستاویزی مظہر زبان ہے سو ہم اس تہذیب کو صرف قدیم زبان کے آئینے میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ آج فلسفہ کو زبان کی مدد سے سمجھنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اسی طرح زبان کو کسی معاشرے کا اہم ترین مظہر سمجھتے ہوئے اس کی مدد سے تہذیب کو سمجھنے کی تھیوری پیش کی جارہی ہے۔

تذکرہ غوثیہ کا ایک اور اہم حوالہ زینت المساجد کا ذکر کا ہے جہاں ناول کا ہیرو گل محمد کچھ وقت گزارتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

" شمال میں ذرا آگے ہی میں گیا تھا کہ ایک نہایت دلکش مسجد نظر آئی۔ اس شہر میں مسجدوں اور مزارات کی کثرت تھی۔ ہم لوگوں کے زمانے میں ایسا نہ تھا۔ مسجد کے دو مینارے قلم کے نیزوں کی مانند چھریرے اور بہت ہی بلند تھے۔ مسجد سے بالکل متصل ایک سرائے تھی۔ سرائے کے دروازے پر اونٹ، گھوڑے، پالکیاں، خوانچے والے، اس طرح کے بہت سے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ یعنی یہ سرا اب لگ آباد تھی اور میں یہاں ٹھہر سکتا تھا۔ میں مسجد کی عمارت کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ صدر دروازے پر جو کتبہ تھا اس کے مطابق اس مسجد کا نام زینت المساجد تھا اور اسے محی الدین اورنگ زیب عالگیر کی بیٹی زینت النسا بیگم نے ۱۱۱۹۔۔۔؟ ۱۱۱۹ میں؟ بنوایا تھا۔ میں نے آنکھوں کو خوب رگڑ کر صاف کیا، پھر ہر طرف غور کر کے دیکھا، وہی تاریخ ۱۱۱۹ نظر آئی۔ واللہ ایسا اسرار مجھ پر نازل ہو، یہ نہیں ہو سکتا۔ ارے صاحب جب میں ننگل خورد سے چلا تھا تو سنہ ۹۲۸ تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے اور سلطان ابراہیم لودی کو فرمار وائی کرتے چار سال ہو رہے تھے۔ تو کیا یہ مسجد اس

کے کوئی دو سو برس بعد بنی تھی ؟ تو کیا واقعی ابراہیم لودی ہی نہیں اور بھی بہت کچھ
میرے ننگل خورد چھوڑنے سے لے کر اب تک ہو چکا تھا؟" (۲۰)

'قبض زماں' میں برصغیر کی تاریخ کے جن ادوار کو پیش کیا گیا ہے ان کی داستان بے شک تاریخی تناظر میں ہی نظر آتی ہے لیکن ناول نگار نے یہاں 'آگ کا دریا' والی روایت کو قبول کرتے ہوئے ہر دور کے لیے اسی دور کی زبان استعمال کی ہے۔ اس طرح ہمیں اردو زبان کے ارتقا کے ابتدائی مراحل سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ بیانیہ کی فنی ترتیب کو ادوار کے لحاظ سے تقسیم کر کے 'قبض زماں' کا نام دیا ہے۔

اہل تصوف کے ہاں دو اصطلاحات 'قبض زماں' اور 'بسط زماں' استعمال کی جاتیں ہیں۔ فکشن کے تعمیر کے بنیادی اصولوں کی مدد سے ان صطلاحات کو سمجھتے ہیں۔ فکشن کا تخلیق کار ایسی صنف ادب تخلیق کر رہا ہوتا ہے جس کا بنیادی مزاج بیانیہ ہے یعنی یہ صنف گزرے ہوئے وقت کی کہانی بیان کرتی ہے یوں بیان کرنے کے لیے کسی بیان دینے والے یا والی یعنی راوی کا ہونا ضروری ہے راوی کی متنوع اقسام سے قطع نظر صرف اتنا جاننا ہی بہتر ہے کہ راوی ایک شخص ہے جس پر کچھ واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں، وقوع پذیر ہوتے دیکھتا ہے، کوئی اور اس پر گزرنے والے واقعات کو بیان کرتا ہے یا کسی اور پر وقوع پذیر ہوئے واقعات کو بیان کرتا ہے، اس کو کردار کہتے ہیں۔ ناول نگار یہاں ایک ایسا کردار تخلیق کرتا ہے جو واقعات کو دکھاتا ہے، سوچتا ہے، جھیلتا ہے یا بیان کرتا ہے۔ اب واقعہ کی یہ صورت ہے کہ وہ دو ابعاد (Dimention) میں وقوع پذیر ہوتا ہے بعینہ یہ واقعہ زمان و مکان کی قید میں ہے۔ ناول نگار اس واقعہ کو کردار کی مدد سے دکھاتا ہے چونکہ واقعہ وقت اور جگہ کی حد اندر ہی بیان ہو سکتا ہے اس لیے وہ ضروری طور پر وقت کا انتخاب کرتا ہے اب وہ خدا کی طرح وقت کا خالق ہے۔ جس ترتیب سے وہ واقعات کو جس وقت کے مطابق چاہے بیان کرے یہ اس کی مرضی ہے۔ اسی ترتیب کو ہم فنی طور پر پلاٹ کا نام دیتے ہیں۔ بالکل یہی صورت قبض زماں اور بسط زماں کی بھی ہے۔ یعنی کسی کردار کو روک دینا جب کہ باقی دنیا پر اسی رفتار سے وقت کا چلتے رہنا قبض زماں کہلاتا ہے اور کسی کردار پر وقت کو دراز کر دینا اور باقی دنیا پر بدستور اسی طرح رہنا بسط زماں کہلاتا ہے۔ (۲۱)

ناول نگار کو داستانوی وقت کو اپنے اختیار میں رکھنے کا کھیل اکثر کھیلنا پڑتا ہے اور یہی کچھ شمس الرحمن فاروقی نے 'قبض زماں' میں کیا ہے۔ اردو ناول کی روایت میں قرۃ العین حیدر نے اپنے

ناول 'آگ کا دریا' میں چند ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو تاریخ کے مختلف ادوار میں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے جس زمانے میں کوئی کردار موجود ہے اسی دور کی زبان استعمال کرتے ہوئے بیانیہ کو مکمل کیا ہے۔ اس میں تکنیک بہت سادہ ہے۔ 'آگ کا دریا' نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا، لکھا گیا تھا۔ اس دوران فکشن کی تکنیک میں کئی طرح کے تجربات ہوئے۔ ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ کے بعد شمس الرحمن فاروقی نے اسی ضرورت کے تحت اپنے تخلیق کردہ کردار 'گل محمد' کو بھی زمانوں کے سفر میں دکھانا تھا۔ سو اس نے جدید تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے، مختلف زمانوں میں تہذیبی اقدار کو دکھانے کے لیے کردار کو ایک زمانہ میں تخلیق کر کے ماورائے فطرت واقعہ (قبض زماں) کے ذریعے دوسرے زمانے میں لے جا کر تاریخ و تہذیب کی نسبتاً جدید صورت حال کی عکاسی کی ہے۔ اب اسی طریقہ کے مطابق پہلے راوی کے ذریعے کہانی ایک نئی زقند کے طفیل زمانہ حال میں واپس آتی ہے۔

اس طرح ماجرے کا مختلف ادوار میں وقوع ہونا ہر دور کی الگ زبان کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ یہیں پر ناول نگار ہمیں اپنے پسندیدہ میدان میں واپس لاتا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کا تصنیفات کا مکمل جائزہ اور ان کے افسانوی مجموعے اور دوسرے ناول 'کئی چاند تھے سر آسمان' کا مطالعہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان کو قدیم اردو زبان سے دلچسپی ہے جس کے اظہار کا ایک اور ثبوت 'اردو کا ابتدائی زمانہ' بھی ہے اور اسی ناول میں ہر دور کی زبان اپنے ذخیرہ الفاظ اور جملوں کی بناوٹ کے حساب سے ہمارے سامنے ہے۔ مثلاً ناول کے پہلے صفحے پر ہی وہ لکھتے ہیں :

> "ذرا علم لسان کی شدبد ہوئی تو معلوم ہوا کہ زبان یوں ہی الل ٹپ ہوتی ہے۔ لفظ الل ٹپ سے اب شاید بہت سے لوگ واقف نہ ہوں، اس لیے اس کا انگریزی ترجمہ arbitrary عرض کیے دیتا ہوں (گویا اس انگریزی لفظ کے جاننے والے بہت ہوں گے۔۔۔" (۲۲)

اور یوں اسی 'الل ٹپ' زبان کی مدد سے انہوں نے ہندوستان کے مرحوم گنگا جمنی تہذیب کی پرتیں کھولیں ہیں اور ہندوستان کے ارتقا یافتہ گنگا جمنی تہذیب کے ساتھ ساتھ بتدریج صاف اور شگفتہ ہوتی اردو زبان کو پیش کیا ہے۔ جیسا کہ میر امن دہلوی نے دیباچہ 'باغ و بہار' میں جان گل کرسٹ کی تعریف ضمن میں لکھا ہے۔ منقول ہے کہ:

"امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت، بلکہ احمد شاہ اور عالم گیر ثانی کے وقت تک، پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی؛ نداان زبان اردو کی منجتے منجتے ایسی منجی کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی؛ لیکن قدر دان منصف چاہیے، جو تجویز کرے۔ سواب خدا نے بعد مدت کے جانگل کرسٹ صاحب سادانا، نکتہ رس پیدا کیا کہ جنھوں نے اپنے گیان اور اکت سے اور تلاش و محنت سے قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں؛ اس سبب سے ہندوستان کی زبان کا ملکوں میں رواج ہوا اور نئے سر سے رونق زیادہ ہوئی۔" (۲۳)

یہ تفصیلی بحث ان نکات کو واضح کرتی ہیں جن کی بنیاد یہ نتائج نکالے جاسکتے ہیں کہ ناول نگار نے مختلف زمانوں میں اپنے کردار کو پیش کرنے تصوف کی اصطلاحوں کی مدد لی ہے اور قاری کی تبدیلیوں کے ذریعے ناول کا بیانیہ مکمل کیا ہے جو ان کی مہارت کا بین ثبوت ہے۔ جدید ناول نگاروں کے ہاں عالمی سطح پر ہونے والی تکنیکوں کو برتنے کا رواج بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے ناول کے موضوعات اور فنی ذرائع میں وسعت آئی ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ جولیئن وولفر اور دوسرے، ''کی کنسیپٹ ان لٹریری تھیوری'، ایڈن برگ یونیورسٹی پریس، ایڈن برگ، ۲۰۰۶ء

According to Saussure, a sign comprises a sound image ,or signifier , and a concept, or signified .('Key Concepts in literary theory' Julian Wolfreys and others, 2006 , 2nd Ed. Edinbergh University Press Ltd. Edinbergh

۲۔ عالمی سطح پر لائبریریوں کو تصویر بنا کر ایسی شکل میں لایا جا رہا ہے جو انٹرنیٹ کے ذریعے ہر ایک کے لیے رسائی کے قابل ہوں۔ یہ معاصر صورت حال حیران کن ہے۔ معلومات کے حصول کے لیے محققین اور طالب علم دنیا کی اس سب سے بڑی لائبریری یعنی انٹرنیٹ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ سب سے سستا اور آسان ترین ذریعہ ہے۔ انٹرنیٹ پر مخصوص سرچ انجن search engine صارف کو متعلقہ معلومات کے بنیادی ماخذات کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے بہت ساری websites کو پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن جو کچھ صارف طلب کر رہا ہے وہ سارا کچھ یہی ہے یا یہ وہ ہے جو سرچ انجن کے منتظمین بتانا چاہ رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ ایسی تمام معلومات جو عام کرنا چاہ رہے ہیں ارزاں کرتے ہیں اور جس کی اشاعت ان کے مفاد کے خلاف ہے وہ ڈیجیٹل ذخیروں سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ یوں آج سچ وہ نہیں جو ہر آدمی جان رہا ہے بلکہ وہ ہے جو مقتدر قوتیں ہمیں سکھا رہی ہیں۔

۳۔ پائیلو کوئیلو(۱۹۴۷ء۔) کے ناول The fifth Mountain(1996) کی کہانی بڑی حیرت انگیز ہے شہر کے حکمرانوں میں گورنر اور لاٹ پادری فیصلہ کا اختیار رکھتے ہیں۔ وہ دونوں اس نکتہ اس پر مقابل ہیں کہ شہر کے لوگ لکھنے کا فن سیکھیں یا یہ فن ان کے لیے ممنوع ہو گا۔ دشمن شہر کا محاصرہ کیے ہوئے ہے گورنر جو فن کے سیکھنے کا حامی ہے دشمن سے صلح کا خواہست گار ہے جبکہ لاٹ پادری اس فن کو شہر کے باسیوں کے لیے مضر سمجھتے ہوئے اس کو ممنوع کرنے کے حق میں ہے، جب دیکھتا ہے کہ عوام گورنر کے ساتھ ہے اور میرا فیصلہ قبولیت کا شرف حاصل نہیں کر پائے گا تو قیدی کے قتل کے ذریعے دشمن کو شہر پر حملے کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔ یوں اس کی سوچ کے عین مطابق شہر کے باسیوں کو سمیت گورنر اور لاٹ پادری تہ تیغ کر دیا جاتا ہے۔ یوں جدید خیال کی ترسیل ایک زمانے کے لیے رک جاتی ہے۔

۴۔ جدید سماجی اور تنقیدی تھیوریز، ڈسکورس، ساختیات، رد تشکیل، متن اور مصنف، مرکز اور مبدا کی مثال

۵۔ جدید لسانیات میں زبان کے بارے میں ساختیاتی نظریہ لفظوں میں معنی کی پیدائش کا ذمہ دار معاشرہ کو قرار دیتا ہے جو ساخت کو تعمیر کرنے اصل ذریعہ ہے۔

۶۔ فاروقی، شمس الرحمن، 'قبض زماں'، شہرزاد، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۰،۹

۷۔ محمد اکرام، شیخ، 'آب کوثر'، 'رود کوثر' اور 'موج کوثر'، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۹۶ء، انیسواں ایڈیشن

برصغیر میں مسلمانوں کی مذہبی و علمی تاریخ پر یہ تین سلسلہ وار کتابیں تین اہم ادوار کا احاطہ کرتی ہیں۔ 'آب کوثر' عربوں اور ہندوستان کے قدیم تعلقات سے لے کر مغلوں تک کے دور کا بیان ہے (۷۱۲ء سے ۱۵۲۵ء تک)۔ 'رود کوثر' مغلیہ عہد کی مکمل تاریخ ہے (۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک) جب کہ موج کوثر انیسویں صدی کے آغاز سے زمانہ حال یعنی قیام پاکستان تک کی تاریخ ہے۔

۸۔ نجیب محفوظ، 'نوبیل انعام کا خطبہ' ترجمہ، آصف فرخی، مشمولہ 'ناول کا نیا فن' سٹی بک پوائنٹ، کراچی ۲۰۱۸ء، ص ۲۰۸

۹۔ تفصیل کے لیے ۔۔۔۔ دیکھیں، 'مفتاح العلوم'، شرح مثنوی مولینا روم، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

۱۰۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان میں داستان بیان کی جاتی ہے اور وہ یا تو خود مصنف کی زبانی یا اس کے کسی کردار کی زبانی یا ہمہ دان راوی کی زبانی، لیکن اس پر بھی کچھ ناقدین کو اعتراض ہے وہ اس نکتہ نظر سے بیانیہ کو نہیں دیکھتے۔ یہاں میں نے یہ لفظ لغوی معنوں میں استعمال کیا ہے تفصیل کے لیے دیکھیں: محمد حمید شاہد، اردو افسانہ صورت و معنی، انتخاب، یسین آفاقی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

۱۱۔ آصف فرخی، 'ناول کا نیا فن'، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۱۸ء

۱۲۔ ملک، عبدلعزیز، 'اردو افسانے میں جادوئی حقیقت نگاری'، شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا، ۲۰۱۴ء

۱۳۔ کڈن، جے۔ اے، 'ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز اینڈ لٹریری تھیوری'، پینگوئن بکس، یو کے ۱۹۹۹ء

"Some of the characteristic feature of this kind of fiction are the mingling and juxtaposition of the realistic and the fantastic or

bizarre, skillful time shift, convoluted and even labyrinthine narrative and plot, miscellaneous use of dream, myths and fairy stories, expresionistic and even surrealistic description, arcane erudition, the element of surprise and abrubt shock, the horrific and the inexplicable."(pp488)
J.A.Cuddon, 1999, 'Dictionary of litrary terms and litrary theory', Penguin Books UK, 4th Ed.

۱۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، 'تنقیدی اصطلاحات کی توضیحی لغت' ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۱ء، ص ۲۵۲

تفصیل یوں ہے کہ ناول کا لغوی معنی انوکھا اور عجیب و غریب کا ہے، اس تصور کو ناولائی تصور کے نام دیا جاتا ہے۔

۱۵۔ فاروقی، شمس الرحمن، ۲۰۱۴ء، ص ۲۹

۱۶۔ پانی پتی، سید غوث علی شاہ، 'تذکرہ غوثیہ' مؤلف مولوی شاہ گل حسن، اللہ والے کی قومی دوکان، لاہور سن ندارد

برصغیر کے معروف صوفی سید غوث علی شاہ پانی پتی کے ایک مرید مولوی گل حسن نے ان کے فرمودات کو کتابی شکل میں تالیف کیا اور اس کا نام 'تذکرہ غوثیہ' رکھا۔ یہ قریب قریب ۱۸۸۷ء میں رقم کیے گئے تھے۔

۱۷۔ زمین حرکت کر سکتی ہے گل محمد کا حرکت کرنا ناممکن ہے۔

۱۸۔ فاروقی، شمس الرحمن، ۲۰۱۴ء، ص ۳۰

۱۹۔ ایضاً، ص ۸۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۹۷ (تذکرہ غوثیہ میں یہ واقعہ صفحہ ۲۸، ۲۷ اور ۲۹ پر درج ہے، شہزادی زینب النساء کی مسجد اور مرزا غالب سے)

۲۱۔ قرآن حکیم میں دونوں طرح کے واقعات کا ذکر ہے۔ 'قبض زماں' کے لیے اصحاب کعف کا واقعہ اور 'بسط زماں' کے لیے حضرت عزیرؑ کا واقعہ جب وہ کچھ دیر کے لیے گھر سے نکلے لیکن ان پر سو سال یا کم و بیش کا عرصہ گزر گیا۔

۲۲۔ فاروقی، شمس الرحمن، ۲۰۱۴ء، ص ۱۳

۲۳۔ میر امن دہلوی، 'باغ و بہار' مرتبہ، رشید حسن خان، مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۸